ڈاکٹر نذیر احمد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

قدیم ایرانی عناصر اُردو ادب میں

(۲)

تہماسپ

تہماسپ زو (زاب) کا باپ تھا۔ اس کی اوستائی شکل توماسپ ہے جس کے معنی صاحب اسپاں فربہ ہے۔ پہلوی میں اس کی صورت توہماسپ اور فارسی میں تہماسپ (طہماسب) ہوگئی۔ "بندھشن" کی ایک روایت کی بنا پر وہ نوذر کا بیٹا اور منوچہر کا پوتا تھا۔ مگر بیرونی نے اس کو منوچہر کی ساتویں پشت میں بتایا ہے۔ لیکن "مجمل التواریخ" اور تاریخ طبری میں اسے منوچہر کا بیٹا قرار دیا ہے۔ طبری کی روایت[1] یہ ہے:

"منوچہر را پسری بود، نام او طہماسپ ومنوچہر بر او خشم گرفتہ بود و خواست کہ بکشتش بداں سبب کہ او را دختری بود و طہماسپ بزنی کردہ[2] بود۔ پس سرہنگان طہماسپ را درخواستند، بدیشانش بخشید و گفت کہ از پادشاہی من بیرون شود۔ آن دختر کہ زن او بود ببستید و در خانہ بازداشت و منجمان گفتہ بودند کہ او را ازیں زن پسری باشد کہ پادشاہ شود، پس او را پسری آمد زاب و پسرش کودک بود کہ منوچہر بمرد۔"

کَے

کے اوستائی لفظ کوی سے نکلا ہے جو پہلوی میں کے اور فارسی میں کے ہوگیا ہے۔ کلمۂ کوی "گاتھا" میں مطلق امیر اور شاہ کے معنوں میں آیا ہے۔ البتہ "اوستا" کے آخری حصوں میں ایک خاندان کا لقب ہے جن میں پہلا قباد اور آخری گشتاسپ ہے۔ لیکن پہلوی اور عربی روایت میں آخری بادشاہ داراب

---

[1] حماسہ سرائی، ص ۴۸۱

[2] مگر بندھشن میں ہے کہ اس نے افراسیاب کے منجم ناموں کی بیٹی سے عقد کیا تھا (حماسہ سرائی، ص ۴۸۰)

[3] حماسہ سرائی، ص ۴۹۳ -

ہے ''شاہ نامہ'' میں یہ کلمہ خاص خاندان کے معنوں میں عموماً استعمال ہوا ہے۔ گویا اس لحاظ سے فردوسی نے پہلوی اور اسلامی روایت کو برتا ہے لیکن حسب ذیل اشعار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم روایت بھی اس کے ذہن میں تھی:

تو بشناس کز مرز ایران زمین — یکی مرد بُد نام او آبتین
ز تخم کیان بود و بیدار بُود — خردمند و گرد و بی آزار بود
تہمتن بہ میدون یکے جام مے — بخورد آفرین کرد بر جان کے

کیقباد[1]

فردوسی کی روایت کی بنا پر جب گرشاسپ مر گیا تو زال نے موبدوں سے لائق بادشاہ کے بارے میں مشورہ کرنا شروع کیا۔ انھوں نے فریدوں کے خاندان کے ایک شخص قباد کا نام تجویز کیا جو کوہ البرز میں رہتا تھا۔ پس زال نے رستم کو اس کے پاس بھیجا۔ قباد نے زال کا پیغام قبول کیا اور رستم کے ہمراہ آیا اور تختِ ایران پر متمکن ہوا۔ کچھ دنوں بعد افراسیاب سے سخت جنگ کی۔ رستم بھی ساتھ تھا۔ اس نے بھی بڑی جوانمردی دکھائی۔ افراسیاب مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور صلح کی بات چیت کرنے لگا۔ چنانچہ اس بات پر صلح ہوئی کہ جیحون ایران اور توران کے درمیان سرحد ہو گی۔ قباد پھر فارس کی طرف متوجہ ہوا اور استخر کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ دس سال سیاحت میں بسر کیے۔ پھر فارس واپس آیا۔ اس طرح سو سال حکومت کی۔ اس کے چار لڑکے تھے۔ کیکاؤس، کے آرش، کے پشین، کے آرمین۔

کیکاؤس[2]: یہ سکندر ہے نہ دارا، نہ کیکاؤس ہے۔

---

[1] اوستا میں کوات کوی، پہلوی میں کوات کے، اور عربی فارسی میں کیقباد ہے۔

کہ جس کے حشمت و جاہ و جلال کو ہرگز — کبھو نہ پہنچے دارا سے لے کے تا بہ قباد (سودا)

قرائن بھی یہی ہیں کہ قباد سے یہی بادشاہ مراد ہے جو ساسانی قباد (یعنی کواذ متوفی ۵۳۱ء) سے جاہ و حشمت میں بڑھا ہوا تھا۔

[2] اوستائی شکل کوی اوسن یا کوی اوسذن اور پہلوی کی اوس ہے۔ اوستا میں کیقباد کے پہلے اس کا نام مذکور ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رگ وید کا نام اوسنس کاوی بھی ہے (ص ۵۰۹)

بھی ہے، (ص ۵۰۹)

فردوسی کی روایت کی بنا پر کیقباد کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ پہلے مازندران پر حملہ کیا۔ وہاں کے بادشاہ ارژنگ شاہ نے دیو سفید سے مدد طلب کی۔ دیو نے کاؤس اور اس کے سپاہیوں کو اندھا کر کے قید کر دیا۔ اس کے ساتھیوں میں ایک بچ گیا تھا۔ اس نے یہ خبر زال کو پہنچائی۔ زال نے رستم کو مازندران بھیجا۔ رستم نے دیو سپید کو مار کر اس کا جگر ایرانیوں کی آنکھوں پر پھیرا۔ اور اس طرح سب کی بینائی واپس آئی۔ کیکاؤس رستم کے مشورہ پر مازندران کو ارژنگ کے بیٹوں کو سپرد کر کے ایران واپس آ گیا۔ کچھ دنوں بعد توران، چین، مکران پر حملہ کیا اور ان کے بادشاہوں کو اپنا باجگزار بنایا۔ پھر بربر پر حملہ آور ہوا۔ شاہ بربر مصر اور ہام آوران کے بادشاہوں کی مدد سے نبرد آزما ہوا۔ مگر تینوں ہار گئے اور کیکاؤس کو خراج دینا منظور کر لیا۔ کیکاؤس نے شاہ ہام آوران کی بیٹی سودابہ سے عقد کیا۔ مگر شاہ نے کسی تدابیر سے اس کو قید کر لیا۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر افراسیاب ایران پر حملہ آور ہوا اور اس کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ بالآخر رستم ہام آوران گیا اور کیکاؤس کو قید سے چھڑایا۔ وہ مع سودابہ ایران آیا اور افراسیاب کو ایران سے باہر نکالا۔ پھر ایک شاہی محل کوہ البرز میں تعمیر کرایا۔ کچھ ہی دنوں بعد دیوؤں کے فریب میں آ کر آسمان پر[1] چلا گیا۔ پھر چین کے جنگل میں زمین پر اوندھا گرا۔ ایرانی پہلوانوں کو اس کی خبر ملی تو وہاں سے اس کو ایران لائے اور وہ نیکی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے بعد رستم اور سہراب کی جنگ، سیاؤش کی داستان، سودابہ کا اس پر عاشق ہونا، اور باپ کا سیاؤش پر غضب کھانا، بیٹے کا توران بھاگ جانا، اور افراسیاب کے ہاتھوں اس کا قتل ہونا، کیخسرو کی داستان اور اس کا ایران کے تخت پر بیٹھنا۔ "شاہنامہ" کے موضوعات ہیں۔ کیکاؤس اس وقت تک جب کہ خسرو نے افراسیاب کو قتل کیا، زندہ تھا۔ اس کی حکومت کی مدت ۱۶۰ سال تھی۔

کیخسرو

"شاہنامۂ فردوسی میں کیخسرو کی داستان سیاؤش[2] کے قتل کے فوراً بعد شروع ہو جاتی ہے افراسیاب کی بیٹی فرنگیس سیاؤش کی بیوی تھی۔ اس کا شوہر جب افراسیاب کے حکم سے قتل ہو گیا تو اس سے ایک لڑکا

---

[1] دینکرت کتاب نہم فصل ۲۲ میں اس کے آسمان پر جانے کی تفصیل ہے۔ (حماسہ سرائی، ص ۵۰۵)

[2] سیاؤش کی داستان کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حماسہ سرائی، ص ۵۱۰، ۵۱۵)

پیدا ہوا جس کا نام کیخسرو رکھا گیا۔ افراسیاب نے اس کو گڈریے کے پاس پہاڑ پر بھیج دیا تاکہ اسے اپنی نسل کا علم نہ ہو سکے۔ اس طرح کیخسرو کی پہاڑوں میں پرورش ہوئی۔ کچھ دنوں بعد پیران اس کو اپنے پاس لے آیا اور بڑی شفقت سے پرورش کرنے لگا۔ پھر افراسیاب کے حکم سے وہ اور اس کی ماں فرنگیس دونو گنگ دژ میں بھیج دیے گئے۔ آخر کار گیو پسر گودرز اپنے باپ کے حکم سے توران گیا اور سات سال کی جستجو کے بعد ان کا پتہ چلا پایا۔ چنانچہ وہ انھیں ایران لے آیا۔ یہاں پہلوانوں میں کیخسرو یا فریبرز پسر کاؤس کے جانشین نامزد کرلینے میں اختلاف رونما ہوا۔ بالآخر طے پایا کہ جو بہمن دژ کو فتح کرے وہی مستحق حکومت ہوگا۔ یہ کام صرف کیخسرو انجام دے سکا۔ اس لیے کہ کیانی فر اُس کے شاملِ حال تھی۔ پھر کیخسرو کاؤس کے حکم سے باپ کے خون کا بدلہ لینے کے درپے ہوا۔ سالوں کی جنگ و خونریزی کے بعد ایک نیک مرد ہوم نامی کے ذریعے قاتل (افراسیاب) کو گرفتار کرکے اس کو مع اس کے بھائی گرسیوز کے قتل کردیا۔ افراسیاب کے قتل کے بعد کاؤس نے کیخسرو کو تخت نشین کردیا اور خود ۱۶۰ سال کی حکومت کے بعد فوت ہوگیا۔ کیخسرو نے افراسیاب کے بیٹے جہن کو قلعہ سے چھڑا کر توران کا تخت بخشا اور خود چند دنوں بعد تخت سے دستبردار ہوا اور لہراسپ کو اپنا جانشین مقرر کرکے طوس، گودرز اور فریبرز کے ساتھ ایک پہاڑ میں ناپید ہوگیا۔

«اوستا» میں کیخسرو ایک زبردست پہلوان اور عظیم بادشاہ کی حیثیت سے آیا ہے۔ ادبیات پہلوی میں اس کا نام کے خسرو اور کے خسروب کی شکل میں ملتا ہے۔ وہ زرتشت کے ظہور کے قبل آئین مزدیسنا پہ کاربند تھا۔ اس نے دو بڑے کام انجام دیے۔ ایک تو افراسیاب کا قتل، دوسرے بد دینوں کے بتکدہ کی ویرانی (جو دریائے چیچست کے کنارے واقع تھا) اور آتشکدہ آذرگشسپ کا قیام (جو کوہ اسنوند پر واقع تھا)۔ اسلامی مؤرخوں نے کیخسرو کی بابت جو اطلاعات بہم پہنچائی ہیں وہ شاہنامہ[۵۲] سے عموماً ملتی جلتی ہیں۔

شبرنگ سیاوش

اردو میں مطلق گھوڑے کے لیے آیا ہے۔ لیکن "برہان قاطع" (ص ۱۲۴۵) میں سیاوش کے گھوڑے کا یہی نام بتایا گیا ہے۔ ڈاکٹر معین نے لکھا ہے کہ صاحب برہان کو دھوکا ہوا ہے۔ در اصل سیاوش

---

۵۱ دیکھیے حماسہ سرائی، ص ۴۹۳، ۴۹۵

۵۲ ایضاً ص ۵۲۴

کے گھوڑے کا نام بہزاد[1] تھا اور وہ سیاہ رنگ تھا، یہی صفت (شبرنگ) "شاہ نامہ" میں اس طرح آئی ہے:

بیاورد شبرنگ بہزاد را — کہ دریافتی روز کین باد را

بہر حال اردو ادب میں گھوڑے کا خیال سیاوش ہی کے گھوڑے کے نام سے پیدا ہوا ہے۔

سودا کے چند شعر ملاحظہ فرمایئے:

جس جگہ سرگرم کاوے پر ترا شبرنگ ہے
گاہ آجائے نظر گاہ نظر سے غائب

پھرا ہوا بیچ وہ شبرنگ ہے جگنوں کی دمک
کاوے میں یہ رکھے ہے وہ شبرنگ رنگ ڈھنگ

تیرے شبرنگ کے جلوے کے تئیں گر دیکھے
کہے وہ اس کو کنھیا ز رہ حُسن و جمال!

افراسیاب

"توران کا بادشاہ تھا جس کا سلسلہ تور پسر فریدون تک پہنچتا ہے۔ تور فریدون کے نواسے منوچہر کے ہاتھوں قتل ہوا، اسی وقت سے توران اور ایران کی پشتینی دشمنی کا آغاز ہوتا ہے۔ افراسیاب ایران کا سخت ترین دشمن تھا۔ اس نے کئی مرتبہ ایران پر حملہ کرکے تباہ و برباد کیا۔ دونوں ملکوں میں وقتی طور صلح ہوجاتی مگر جلد ہی لڑائی چھڑ جایا کرتی۔ یہاں تک کہ سیاوش افراسیاب کے یہاں قید اور پھر اس کے بھائی کے ہاتھ قتل ہوا۔ اس جوانمرد کے قتل نے سارے ایران میں ایک آگ لگادی۔ گیو پسر گودرز توران گیا اور سیاوش کے بیٹے کیخسرو کو ایران لے آیا۔ کاوس نے اس کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اس کے بعد سے دونوں ملکوں میں سخت ترین لڑائیاں ہوئیں۔ بالآخر افراسیاب کو شکست ہوئی اور وہ کیخسرو کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔

---

[1] ڈاکٹر صفا نے اس کا پورا نام شبرنگ بہزاد لکھا ہے۔ (حماسہ سرائی، ص ۲۳۶، ۲۲۷، ۵۱۲) شبرنگ ایک دیو بھی تھا۔ (ایضاً، ص ۳۲۳)

کے لہراسپ

فردوسی کی روایت کے مطابق کیخسرو لہراسپ[1] کو اپنا جانشین مقرر کرکے تخت سے دستبردار ہوگیا تھا۔ ارکانِ سلطنت کے اعتراض پر اس نے لہراسپ کے نسب[2] کے متعلق بتایا کہ وہ کے پشین اور کیقباد کی اولاد میں ہے اور فرکیانی اس کے شامل حال ہے۔ اس طرح لوگ اس کی حکومت پر راضی ہوگئے۔ اور مہرماہ کے روز مہر[3] کو اس کی تاجپوشی ہوئی۔ اس نے بلخ میں آذر برزین[4] نام کا آتش کدہ تعمیر کرایا۔ لہراسپ کے دو بیٹے تھے۔ پہلا زریر، دوسرا گشتاسپ۔ دربار میں کاؤس کے پوتوں میں سے دو موجود تھے۔ ان کی وجہ سے لہراسپ اپنے بیٹوں کی طرف سے بے پروا تھا۔ گشتاسپ اس بات سے ناراض ہوکر پہلے ہندوستان اور پھر روم چلا گیا۔ اور قیصرِ روم کی بیٹی کتایون سے شادی کی۔ بالآخر باپ کی خدمت میں ایران واپس آیا تو لہراسپ اس کو تخت نشین کرکے حکومت سے دستکش ہوگیا اور نوبہار بلخ میں چلا گیا اور خدا کی پرستش میں مصروف ہوا اس کے زمانے میں جب زرتشت نے نئے مذہب کا اعلان کیا تو اس نے یہ مذہب قبول کرا یا۔ آخرکار ارجاسپ[5] تورانی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ لہراسپ نے ۱۲۰ سال حکومت کی۔ اس کے بیٹے گشتاسپ کے زمانے میں زرتشتی مذہب کو بڑا فروغ ہوا۔ اس نے یہ مذہب قبول کرلیا تو ارجاسپ تورانی نے دوبارہ حملہ کیا لیکن گشتاسپ کے بیٹے اسفندیار کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ اسفندیار کو تختِ ایران کی بڑی آرزو تھی۔ مگر گشتاسپ تخت سے دست کش نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس بنا پر اس نے اسفندیار کو رستم سے لڑنے سیستان بھیج دیا۔

---

[1] اوستا میں اس کا نام "کوی ویشتاسپ پسر اوروت اسپ" آیا ہے۔ اس سے پہلوی اور فارسی میں پسر لہراسپ ہوگیا۔

[2] شاہنامہ میں اس کو اروند کا بیٹا اور کے پشین کا پوتا قرار دیا ہے، لیکن پہلوی روایت میں کے پشین کے بیٹے منوش کا پوتا اور اُز کا بیٹا بتایا گیا ہے۔ طبری اور بیرونی کی روایت پہلوی روایت کے مطابق ہے (حماسہ سرائی ص ۵۲۶)

[3] ایران بعہدِ ساسانیاں ۲۲۷۔ اسی دن مشہور تیوہار مہرگان منایا جاتا ہے۔

[4] اس اہم آتشکدہ کی تفصیل مزدیسنا ص ۲۱۵، ۲۱۸ میں بیان ہوئی ہے۔

[5] افراسیاب کے بعد ایران کا سب بڑا دشمن۔ (دیکھیے: حماسہ سرائی صفحہ ۶۲۶، ۶۲۷)

اور وہ رستم کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ رستم نے اسفندیار کے بیٹے بہمن کی پرورش کی۔ گشتاسپ بالآخر بہمن کو سلطنت دے کر فوت ہوگیا۔ گشتاسپ پر کیانی خاندان کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

بہمن

"شاہنامہ" کی روایت کے مطابق سیستان کی جنگ میں اسفندیار کے دو لڑکے مہرنوش اور نوش آذر قتل ہوئے اور صرف بہمن بچ گیا۔ رستم نے اسفندیار کی خواہش کے مطابق اس کی ہر طرح سے تربیت کی۔ کچھ دنوں بعد گشتاسپ نے اسے تخت نشین کیا اور اردشیر کا لقب دیا۔ بہمن سب سے پہلے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے سیستان گیا اور زال پدر رستم کو قید کر لیا۔ پھر فرامرز نے اس کا مقابلہ کیا لیکن اس کو بھی شکست فاش ہوئی۔ اور اس کے بہت سے ہمراہی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اور وہ خود گرفتار، پھر قتل ہوا۔ گشتاسپ کا بیٹا پشوتن بہمن کا وزیر تھا۔ اس کی تجویز پر بہمن نے زال کو معاف کر دیا اور پھر ایران واپس آیا۔ بہمن کے ساسان نام کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہما ملقب بہ چہرزاد تھی۔ بہمن نے اس لڑکی کو اپنا جانشین نامزد کیا[۱] اس کی سلطنت ۹۹ سال رہی۔

بہمن کا نام "اوستا" میں نہیں آیا۔ لیکن پہلوی متون میں وہومن سپندداتان یعنی وہومن پسر سپندداتُ کئی بار ذکر ہے۔ "دینکرت" میں اس کو ان بادشاہوں میں شامل کیا ہے جو زرتشت کے بعد وجود میں آئے اور دین مزدیسنا کے پیرو رہے۔ بعض اسلامی تاریخوں میں اس کو اردشیر اول بادشاہ ہخامنشی اور بعض میں اردشیر دوم سمجھا گیا ہے[۲]

داراب

"شاہنامہ" کی روایت کے مطابق بہمن نے اپنی بہن ہمائے (چہرزاد) سے شادی کر لی تھی اور اس کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اسی سے ایک بیٹا پیدا ہوا جو داراب کہلایا۔ کہتے ہیں یہ بیٹا باپ کی وفات کے بعد پیدا ہوا۔ اس لیے اس کی ماں نے پیدا ہونے پر اس کو ایک صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈال دیا۔ چنانچہ ایک دھوبی نے اس کو نکالا اور اس طرح اس کا نام داراب ہوا۔ پہلوی ماخذ میں اس کا نام

۱۔ حماسہ سرائی، ص ۵۳۸ ۲۔ ایضاً، ۳۹

دارا یا دارے ذکر ہوا ہے اور فردوسی نے تخت پر بیٹھنے کے بعد اس کو دارا کے نام سے یاد کیا ہے۔ کہتا ہے:

چو دارا بتخت کیں بر نشست   کمر بر میان بست و بکشاد دست

داراب نے ۱۲ سال حکومت کی۔ اس کے دو بیٹے تھے، ایک دارا، جو اس کے بعد ایران کا بادشاہ مقرر ہوا۔ اور دوسرے سکندر جو بادشاہِ روم فیلقوس کی لڑکی سے پیدا ہوا اور اپنی ماں کے رشتے سے یونان کا بادشاہ مقرر ہوا۔ بعض مورخوں[1] نے سکندر کی شاہنامہ والی روایت نقل کی ہے۔

دارا

پہلے دارا[2] کا نکل آیا تھا نام   اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا   (غالب)

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا   مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے   〃

پہلے خود دار تو مانندِ سکندر ہو لے   پھر جہاں میں ہوسِ شوکتِ دارائی کر   (اقبال)

تمام مورخوں کے بیان کے مطابق دارا ایران کا آخری (کیانی) بادشاہ ہے جو اپنے باپ داراب کے بعد ایران کا بادشاہ ہوا۔ اس نے شہر زند نوش آباد کیا، لیکن سکندر کی بغاوت اور اس کی تین جنگوں کے بعد کرمان بھاگ گیا اور سکندر سے صلح کی درخواست کی لیکن جب صلح کی صورت نہ نکلی تو اس نے بادشاہِ ہند سے مدد طلب کی۔ سکندر نے اس کو مہلت نہ دی اور اس پر برابر لشکر کشی کرتا رہا۔ بالآخر دارا کے دو بدعہد وزیر ماہیار و جانوسیار نے انعام و جاہ کے لالچ میں اسے قتل کر دیا۔ اس طرح ایران کا ملک سکندر کے قبضے میں آگیا۔ اس روایت کو مورخوں کے بیان سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دارا داریوش سوم ہے جس کے زمانے میں سکندر نے حملہ کیا تھا اور جو اپنے دو مقربین کے ہاتھوں قتل ہوا۔[3]

اسکندر

اُردو ادب کی مقبول ترین تلمیح ہے جو جاہ و جلال کے مجسمے موجد آئینہ، معمارِ سدِ سکندری، آبِ

---

[1] حماسہ سرائی، ص ۵۴۵

[2] دیکھیے دیوانِ ذوق، ص ۱۹۸، ۲۴۵، ۲۶۶، ۲۷۵ وغیرہ

[3] حماسہ سرائی، ص ۵۴۵

آبِ حیواں کے متلاشی کی حیثیت سے بکثرت مستعمل ہے مشکل سے کوئی دیوان ایسا ملے گا جس میں اسکندر کا ذکر نہ ہوا ہو۔ پہلے دیوان غالب سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

حیرت انداز رہبر ہے عناں گیر اے اسدؔ　　نقشِ پائے خضر یاں سدِ سکندر ہو گیا
سدِ اسکندر بنے بہر نگاہِ گل رخاں　　گر کرے یوں امر نہی بوتراب آئینے میں
اسدؔ جز آب بخشیدن ز دریا خضر کو کیا تھا　　ڈبوتا چشمۂ حیواں میں گر کشتی سکندر کی
لبِ نگار میں آئینہ دیکھ آبِ حیات　　یہ گم ہی سکندر ہے محوِ حیرانی
ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر　　گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت
تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا　　گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ　　اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا
کیا کیا خضر نے سکندر سے　　اب کسے رہنما کرے کوئی

غالب نے ایرانی یا یونانی سکندر کے جاہ و جلال کا ذکر نہ کر کے اپنے سکندر کو خضر کا پیرو اور موجد آئینہ اور معمارِ سدِ سکندر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

علامہ اقبال یوں فرماتے ہیں:

نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں کمالِ شانِ اسکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا
کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم!
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغِ سکندری
پہلے خود دار تو مانندِ سکندر ہو جائے
پھر جہاں میں ہوسِ شوکتِ دارائی کر
نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہے وہ قیصری کیا ہے
مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

کنارِ دریا خضر نے مجھ سے کہا باندازِ محرمانہ
سکندری ہو، قلندری ہو، یہ سب طریقے ہیں ساحرانہ

اقبال کے یہاں سکندر جاہ و جلال کا مجسمہ ہے اور آئینہ سازی بھی اس کی عظمت کی افزائش کا سبب ہے۔ اس نے ایرانی یا یونانی سکندر کو خیالی سکندر سے ملا دیا ہے۔

اب ذیل میں سکندر کے متعلق ایرانی روایات کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

قدیم ایرانی و اسلامی روایات میں سکندر کے بارے میں دو قسم کی باتیں ملتی ہیں:

پہلوی متون میں اس بادشاہ کو اکثر گجستک (ملعون) اور اس کا مقام اروم (یونان) بتایا گیا ہے بندھشن کی فصل ۳۳ میں ہے:

"دارای داریان کی حکومت کے دور میں الکسندر کیسر اروم سے ایران شہر پر حملہ آور ہوا اور دارا کو قتل کر دیا اور تمام خاندان شاہی، مغ اور امرا اور بزرگوں کو منتشر کر ڈالا۔ مقدس آگ کو بجھا دیا اور دین مزدیسنا کو ذلیل و خوار کیا اور زند کو اروم بھیج دیا اور "اوستا" کو نذرِ آتش کر دیا اور ایران کو نوّے حصوں میں تقسیم کیا۔ اسی زمانے میں ارتخشتر پاپکان (اردشیر پاپکان) ظاہر ہوا۔ اس نے یونانیوں کو قتل کر کے ایرانی بادشاہی کو دوبارہ زندہ کیا۔"

اسی طرح تمام ساسانی کتابوں میں اسکندر ملعون قرار دیا گیا ہے اور غالباً انہی سے متاثر ہو کر اسلامی مورخوں نے اسے ویران کار کے لقب سے یاد کیا ہے۔ باوجود اس کے "شاہنامہ" میں ایک طرف تو اس کا نسب کیانی اور اسے ایسا شریف، شجاع اور دانشور بتایا گیا ہے جس نے بڑی شاندار فتوحات حاصل کیں۔ دوسری طرف ایک بار اردشیر کی داستان میں اور دوسری بار خسرو پرویز کے قیصر روم کے جواب نامے میں اسے بُرے الفاظ میں یاد کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کے سامنے دونوں روایتیں تھیں۔ دوسری روایت کا ماخذ تو سبھی کتابیں ہیں لیکن پہلی روایت میں ایرانیوں کے قومی تعصب کو دخل ہے۔ سکندر نے جب ایران پر قبضہ کر لیا تو اسے بھی اپنے ملکی بادشاہوں میں شامل کر کے اس کو داراب کا بیٹا گردان دیا۔[۲]

(باقی آئندہ)

---

[۱] حماسہ سرائی، صفحہ ۲۲۶ [۲] ایضاً ۵۴۷

مولانا محمد حنیف ندوی

اسلام کا تصورِ ثقافت

اسلام نے فرد کی ذہنی الجھنوں کو کس حد تک حل کیا ہے، اسے کن اقدار سے مالا مال کیا ہے؟ اور تکمیل وارتقا کی کن منزلوں کی طرف اس کی رہنمائی کی ہے۔ اس بحث سے ہم فارغ ہو چکے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے معاشرہ کی تہذیبی وثقافتی مشکلات کیا ہیں۔ قرآن اجتماعی زندگی کا کیا نقشہ تجویز کرتا ہے اور کس طرح ان شکوک وشبہات کا تسلی بخش جواب مہیا کرتا ہے جو ہماری اجتماعی زندگی کے بارہ میں ابھرتے ہیں۔ یہ بحث مندرجہ ذیل تین ابواب پر مشتمل ہوگی:

۱۔ اسلام کا تصورِ ثقافت۔

۲۔ اسلام اور اس کی سیاسی قدریں۔

۳۔ اقتصادیات میں اسلام کا موقف۔

ثقافت کسے کہتے ہیں؟ کن عوامل سے اس کا تار پود تیار ہوتا ہے۔ اس کی غرض وغایت کیا ہے۔ اس کی اپنی چال کا نہج کیا ہے اور یہ کن اصولوں کو اپناتی ہے اور کن عناصر کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتی ہے۔

ان سوالات کے جوابات اگرچہ خالص علمی نوعیت کے حامل ہیں تاہم ان سے نمٹے بغیر بحث کو آگے بڑھانا مشکل ہوگا۔ مشکل بھی ہوگا اور غیر مفید بھی۔

ثقافت دراصل انگریزی لفظ کلچر (CULTURE) کا ترجمہ ہے۔ زندگی کے اسلوب وانداز کے معنوں میں سب سے پہلے اس لفظ کو بیکن نے استعمال کیا۔ اور پھر ادبی دنیا میں چل نکلا۔

اس کی صحیح صحیح منطقی تعریف اتنی ہی محال ہے جتنی خود زندگی کے دائرہ اطلاق کی جس طرح زندگی کے فہم وادراک کے متعدد پیمانے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اسلوب زندگی کو سمجھنے کے لیے

بھی کوئی ایک ہی پیمانہ یا لگی بندھی تعریف نہیں ہو سکتی۔ مختلف لوگوں نے اس کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔ جمالیات کے پرستاروں نے تصویر، مجسمہ سازی اور نغمہ و لے میں اس کی جھلک دیکھی ہے۔ اخلاقیات کے شیدائیوں نے اُسے خیر، خوبی اور کمال میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اجتماعیات پر نظر رکھنے والوں نے اسے انسان کی ان کوششوں میں ڈھونڈھنے کی جد وجہد کی ہے جن سے زندگی کے اشکلات تضاد کی گرفت سے نکلتے اور آزاد ہوتے ہیں پھر ایک اور تقسیم بھی ہے کچھ لوگوں نے ثقافت سے مادی ترقیات ہی مراد لی ہیں ــــــ اور کچھ وہ ہیں۔ دین جن کے نزدیک اس کا اہم اور ناگزیر جزو ہے۔ غرض یہ ہے کہ زندگی کا حسنِ طناز چونکہ ہزار شیوہ ہے اس لیے اس کی توجیہات بھی گونا گوں ہیں۔ اس سلسلہ میں اہم علمی کوشش یہ ہے جس کو A. L. KROEBE اور اس کے ایک فاضل دوست نے انجام دیا۔ ان دونوں نے ثقافت کی سینکڑوں تعریفات کو جانچا پرکھا۔ ان پر تنقید و تفحص کا حق ادا کیا اور آخر کار جس پر اُن کا اتفاق ہوا وہ یہ ہے۔

"ثقافت دراصل کچھ نمونوں اور معیاروں سے تعبیر ہے۔ یہ معیار چاہے ظاہر اور نمایاں ہوں۔ چاہے زندگی کے دبیز پردوں میں نہاں ہوں۔ نیز ثقافت کا اطلاق سلوک و معاملگی اس نوعیت پر ہوتا ہے جس کو بربنائے شعور و آگہی اختیار کیا گیا ہو اور ایک گروہ نے دوسرے گروہ تک اس کو پہنچایا ہو معاملہ و سلوک کی یہ نوعیتیں درحقیقت رموز ( ) ہیں۔ جو یہ بتاتے ہیں کہ کسی گروہ نے کیا ترقی کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ثقافت کے معنی ایسی روایت کے ہیں جو سابقہ و حال کے تجربات پر مبنی ہوتی ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مستقبل کی تعمیر میں یہ طریق زندگی کس حد تک کام آسکتا ہے۔

ٹھیٹھ منطقی اصطلاح میں اسے تعریف کہنا مشکل ہے لیکن اگر خود تعریف کی تعریف یہ ہے کہ جس سے کسی حقیقت پر روشنی پڑتی ہو تو ان معنوں میں یہ بلاشبہ تعریف ہے۔ اس میں ثقافت کے جن ضروری اجزا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) ثقافت کا حقیقی تعلق معیار سے ہے۔

(۲) اس میں شعور و ادراک بھی ایک اہم عامل ہے۔

(۳) یہ بھی ضروری ہے کہ یہ معیار کسی نوع یا معاشرہ کی عملی زندگی میں جاری و ساری ہو۔

(۴) اس طرزِ زندگی کو اس نہج کا ہونا چاہیے کہ اس پر صحت مند مستقبل کی تعمیر ہو سکے۔

۱۹۵۰ء تک امریکہ کے ماہر اجتماعیات قریب قریب اس تعریف پر متفق رہے۔ برطانوی مدرسہ فکر نے ثقافت کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے۔

"ثقافت ایسی شعوری وحدت کو کہتے ہیں جو موجود، کارفرما اور کسی معاشرہ کی ضروریات کی متکفل ہو۔ اور نظم و قاعدہ میں منسلک ہو" یہ یاد رہے کہ برطانوی مدرسہ فکر میں شعوری عمل کو نسبتاً زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہی نہیں بعض حضرات تو ثقافت کی تعریف میں جمالیات (Aesthetics) کو بھی ایک اہم عنصر گردانتے ہیں۔ چنانچہ آرنلڈ کا کہنا ہے۔ ثقافت کا تعلق علم و ادراک کی اس جامع کیفیت سے ہے جو ان تمام خوبیوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہو۔ جن سے اب تک انسان آشنا ہو چکا ہے۔ ان کے نزدیک ثقافت کے معنی کمال (Perfection) کو جاننے اور معاشرہ میں رائج کرنے کے ہیں۔

سر ولیم گل برٹ کے نقطۂ نگاہ سے ثقافت کا تعلق کسی قوم یا معاشرہ سے زیادہ باکمال افراد سے ہے۔ اُن کا قول ہے۔

"اگر تم لطیف اور بلند تر ذوق کی جھلک دیکھنا چاہتے ہو تو ان نادر الوجود لوگوں کی تلاش کرو جو صحیح معنوں میں تہذیب و ثقافت کے حامل ہیں۔

تعریف میں یہ تنوع جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، کچھ تو خود زندگی کے تنوع کی وجہ سے ہے اور کچھ اس لیے کہ اس کے مشمولات یا دائرہ اطلاق میں تنوع پایا جاتا ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے اجتماعی سلوک و عمل ہی پر توجہ مرکوز رکھی۔ کچھ لوگ اس سے آگے بڑھے اور ان کی نظر ان پیمانوں اور معیاروں تک پہنچی جن کی وجہ سے کسی گروہ یا معاشرہ میں سلوک و عمل پیدا ہوتا ہے۔ پھر ایک گروہ نے اس میں یوں تطبیق دینے کی کوشش کی۔ کہ ثقافت سلوک و عمل اور معیار و پیمانہ دونوں کا نام ہے۔ ایک کا نہیں۔ ایک اور قلیل جماعت نے اس کے معنوں میں وسعت پیدا کی اور اس کو چنگ و رباب، نغمہ و لے اور تصویر و مجسمہ تک پھیلا دیا۔

بہرحال اپنی اپنی نظر اور اپنا انتخاب ہے۔ ہمیں تو یہ تعریف زیادہ پسند ہے کہ ثقافت میں فکر و عمل کی وہ تمام کوششیں داخل ہیں جو کسی نہ کسی تضاد کو رفع کرتی ہیں۔ چاہے یہ تضاد جسم و روح میں ہو۔ چاہے انسان اور اس کے عالم خارجی میں پایا جائے اور چاہے اس کا تعلق ان الجھنوں سے ہو جو انسان اور انسان کے مابین رونما ہیں۔ یعنی اگر کوئی تہذیب انسانی مشکلات کا کوئی مداوا تجویز نہیں کرتی تو وہ سرے سے تہذیب ہی نہیں۔

ہم ثقافت میں فکر و عمل کی تمام کوششوں کو اس بنا پر داخل سمجھتے ہیں کہ ہمارے نزدیک تہذیب و ثقافت کا تانا بانا ان دونوں سے مل کر تیار ہوتا ہے۔ نہ تنہا فکر و تصور کی استواریاں اس لائق ہیں کہ کسی ثقافت کی تخلیق و آفرینش میں حصہ لے سکیں اور نہ عمل، روایات اور واقعات و حالات کی تاریخی ترتیب اس قابل ہے کہ نئی تہذیب و ثقافت کی داغ بیل ڈال سکے۔ اس مسئلہ میں اختلاف رائے قدیم سے چلا آرہا ہے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تہذیب و تمدن کی گہما گہمی عقل و خرد کی اعجوبہ طرازیوں کی رہین منت ہے اور یہ دبستان صرف اس وقت تک سرسبز و شاداب رہتا ہے جب کچھ غیر معمولی ذہن اور نابغۂ روزگار شخصیتیں اس کی آبیاری میں مشغول ہیں۔ دوسرا گروہ افراد سے زیادہ تاریخ ساز قوتوں پر بھروسا رکھتا ہے ان کی یہ رائے ہے کہ خود فکر و تصور کا ہیولیٰ مادی حالات و ظروف کی اثر اندازیوں سے تیار ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک تہذیب و ثقافت کے حسین نقوش صفحۂ وجود پر ابھارنے والی چیز ذہن نہیں۔ فکر و تصور کی بلند پروازیاں نہیں۔ افراد اور ان کا کردار و عمل نہیں۔ یاں یوں کہیے کہ انسانی عظمت نہیں بلکہ وہ مادی عوامل ہیں، وہ حالات و شرائط ہیں اور تاریخ کے وہ پُرزور تقاضے ہیں جن سے فکر و تدبر کے حدود متعین ہوتے ہیں۔

ہم اس بحث میں پڑے بغیر کہ فکر و روح کی کیا حقیقت ہے؟ اور فکر پہلے ہے یا مادی حالات۔ یہ کہیں گے۔ دونوں میں دراصل کوئی تناقض نہیں۔ جو لوگ فکر و ذہن کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہیں وہ کبھی یہ نہیں کہتے کہ فکر و ذہن کی ترکتازیوں کے لیے مادی حالات و تغیرات کسی دائرہ کو متعین نہیں کرتے۔ اسی طرح جو حضرات تاریخ ساز قوتوں کو اہمیت دیتے ہیں وہ قطعی تاریخی جبر کے قائل نہیں ہو سکتے اور نہ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ تہذیب و ثقافت کی تخلیق و پرورش میں انسانی فکر و کاوش کا اہم حصہ ہے اس لیے کہ تاریخ کا تعلق بہرحال ان واقعات و حادثات سے نہیں ہے جس سے پہاڑ، پتھر یا درخت دوچار ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ ان واقعات و حالات کا آئینہ ہے جس کو انسان اور ذی عقل انسان نے پیدا کیا اور ترتیب دیا ہے۔

ہمارے نزدیک اس نزاع میں قولِ فیصل یہ ہے کہ اگر فکر و تصور یا کوئی نظریہ حیات ٹھیک اس راہ پر گام فرما ہے جو تاریخ کے مطابق ہے اور حالات و ظروف کے اندرونی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے تو صحیح ہے اور اس کا کردار تخلیقی اور تقدم پسندانہ ہے۔ ورنہ یہ خدشہ ہے کہ ثقافت کا قافلہ پیچھے رہ جائے اور تکمیل و ارتقا کی منزلوں کو پا ہی نہ سکے۔ وجہ ظاہر ہے چونکہ ان تاریخ ساز عوامل کو انسان کی عظمت

فکر نے جنم دیا ہے اس لیے ضروری ہے کہ خود ذہن اور فکر و تعقل کے تقاضے ان کا احترام کریں۔ یہ تاریخ کی جبریت یا مادی حالات و شرائط کی مطلق العنانی نہیں۔ انسانی کی تخلیقی قوتوں کا ثمرہ اور صدیوں کی شعوری جدوجہد کا منطقی نتیجہ ہے۔ جس کو ہم تاریخ کے روپ میں دیکھتے ہیں اور تاریخی تقاضوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس مسئلہ میں گھپلا یہ ہے کہ جب ہم تاریخ ساز قوتوں کا نام لیتے ہیں یا تاریخی تقاضوں کا ذکر کرتے ہیں تو پہلے سے خواہ مخواہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ تاریخ یا تاریخ کے یہ تقاضے، انسانی فکر و کاوش کے صدیوں کے تجربہ سے الگ کوئی مستقل بالذات جابر و قاہر قوت ہیں جن کے مقابلہ میں انسان بالکل بے بس اور مجبور ہے حالانکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ خود انسان نے علم و آگہی میں جس حد تک ترقی کی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کو جس قدر رواج دیا ہے اور اس کے نتیجے میں جو نئے مسائل نئے سوالات اور نئی قدریں اُبھری ہیں ان کی حیثیت ایک چیلنج کی ہے جس کو سمجھے اور جس سے نمٹے بغیر انسانی تہذیب و تمدن کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ یہاں سوال انسانی مجبوری کا نہیں، تگ و تاز اور سعی کوشش کے دائروں کے تعین کا ہے۔

تاریخی تقاضے انسانی فکر کی تازہ کاریوں کو روکتے کب ہیں؟ یہ تو اس کے برعکس اس کی راہیں ہموار کرتے ہیں، اس کی منزل مقرر کرتے ہیں اور اس کے اندر اجتہاد و اختراع، ان مخفی اور تخلیقی قوتوں کو اُبھار دینے کا باعث ہوتے ہیں جن سے مسائل کے حل و کشود میں مدد مل سکتی ہے۔

ہم اس بات کے قائل نہیں کہ تاریخی تقاضوں کی روشنی میں پہلے پیداوار کے ذرائع اور کو الف بدلے ہیں اور پھر سائنس اور ٹیکنالوجی نے ترقی کی ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں، پہلے سائنس نے ترقی کی ہے انسانی علم و دانش نے معجزات دکھلائے ہیں اور اس کے بعد پیداواری قوتوں میں تجدید ہوئی ہے۔ اسی طرح ہمارا یہ عقیدہ نہیں کہ سقراط، افلاطون، ارسطو، کوپرنیک اور بیکن کو تاریخی تقاضوں نے جنم دیا ہے۔ اس کے برعکس ہم اس حقیقت کے قائل ہیں کہ یہ فکر و دانش کے ان پیکروں کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے ایسی تاریخ کی تخلیق کی ہے جس نے آئندہ چل کر تہذیب انسانی کو چار چاند لگائے ہیں ہاں یہ صحیح بات ہے۔ اس تاریخ نے جس کے اوراق پریشان کی انسان کے دست ہنر شناس نے شیرازہ بندی کی ہے ترقی کے کچھ آئندہ حدود ضرور متعین کیے ہیں اور آگے کی سمتیں کچھ ضرور بتائی ہیں۔ لہذا فکر انسانی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ ایسی زقند لگا کر اپنے سفر کو انہی نقاط سے شروع کرے کہ جن نقاط سے یہ عرصہ ہوا آگے نکل آیا ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ اپنے دور کے ان مسائل اور تقاضوں سے روگردانی اختیار کر سکے۔

اس مختصر وضاحت کے بعد اس سوال کا جواب نسبتاً آسان ہو جاتا ہے کہ ثقافت کا تار پود کن عوامل سے تیار ہوتا ہے ہم کہہ چکے ہیں کہ ثقافت نظریہ وعمل سے ترتیب پذیر ہے اب یہ جاننے کی چیز ہے کہ نظریہ کے دو پہلو ہیں۔ مادی اور اخلاقی و روحانی۔ جہاں تک اس کے مادی پہلو کے ارتقا کا تعلق ہے ہم کہہ چکے ہیں کہ اس کا تمام تر سہرا انسان اور اس کی شعوری کوششوں کے سر ہے انسان نے اس کو ترقی دی ہے۔ انسان نے اسے بنایا اور سنوارا ہے لیکن کیا نظریہ کا اطلاق صرف انسان کی مادی ترقیات ہی سے متعلق ہے یا اس کا دائرہ اس سے کہیں وسیع تر ہے اور اس میں وہ جملہ اخلاقی و روحانی اقدار شامل ہیں، جن سے کوئی ثقافت زندہ رہتی پنپتی اور آگے بڑھتی ہے اور جن سے مختلف قوموں کے حدود امتیاز نکھرتے ہیں اور ان کے مخصوص طرز عمل کی وضاحت ہوتی ہے۔ ہماری رائے میں اس سلسلہ میں ادیان ومذاہب کے کردار کو نظر انداز کر دینا تاریخ کے ساتھ سراسر زیادتی اور ظلم روا رکھنے کے مترادف ہو گا۔ انسانی نظریات اور دینی نظریات میں ایک فرق ہے انسانی نظریہ کی غلطیاں اور خامیاں عمل سے واضح ہوتی ہیں اور طویل تجربے سے قوموں کو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کہاں کہاں خلل ہے یا نظریے کی کن خامیوں کی وجہ سے ان کی تہذیب و ثقافت میں تضادات ابھرے ہیں۔ اس لیے کہ انسانی علم بہرحال ناقص ہے اس کی صلاحیتیں حد درجہ محدود اور سمٹی ہوئی ہیں لہذا مستقبل کی آغوش میں جو تبدیلیاں رونما ہونے والی ہیں، اس کا پہلے سے علم کسی بھی شخص کو نہیں ہو سکتا۔

اس کے برعکس زندگی کے بارہ میں دین کا نظریہ اس اسلوب حیات سے تعبیر ہے جس کو اس ذاتِ گرامی نے متعین کیا ہے جس نے خود زندگی کو زندگی بخشی ہے جس نے ذرہ کو خلیہ اور خلیہ کو گوشت پوست کے روپ میں ڈھالا ہے، جس کا علم کامل ہے اور اس درجہ وسیع اور محیط ہے کہ ماضی و مستقبل کے تمام احوال وکیفیات میں سے کوئی چیز بھی اس سے اوجھل نہیں۔

دینی نظریہ حیات کن معنوں میں تہذیب وثقافت کا ناگزیر جزء ہے۔ اس پر دو پہلوؤں سے گفتگو ہو سکتی ہے ایک ماضی کے نقطہ نظر سے اور ایک اس نقطہ نظر سے کہ انسان نے اس کو چھوڑ کر اور اس کے روحانی و اخلاقی ورثہ سے محرومی اختیار کر کے تباہی و بربادی کی کن کن نوعیتوں کو انگیز کیا ہے۔ ظاہر ہے، یہ پہلو اتنا نمایاں اور مسلمہ ہے کہ اس پر بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ مغرب میں اب متعدد اہل فکر نے اپنی زندگی کا مشن یہ بنا لیا ہے کہ تہذیب جدید نے جس بے راہ روی کو ابھار دیا

ہے اس کے خلاف تحریری دو عملی سطح پر جنگ کی طرح ڈالیں اور ایسے اداروں کی تشکیل کریں جو قلب و روح کو ان محرومیوں سے انسانی معاشرہ کو باز رکھنے کی کوشش کریں جن کی وجہ سے انسان محض جنسی حیوان ہو کر رہ گیا ہے۔ جہاں تک ماضی کا تعلق ہے ہم یہ اہلِ دانش سے پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہ انبیا علیہم السلام ہی کا ایک گروہ ہے جس نے انسان کو علم و ادراک کی پہلی روشنی عطا کی، جس نے اس کی تربیت کی ذمہ داریاں سنبھالیں، اور ہر ہر دور میں گمراہی اور ضلالت سے بچانے کی سرتوڑ کوشش کی جس نے اس میں عظمتِ انسانی کے مٹے ہوئے نقوش کو اُجاگر کیا جس نے اسے حسنِ عقیدہ اور حسنِ عمل کی راہیں سجھائیں۔ جس نے محبت و اُلفت کا اول اول درس دیا۔ جس نے دلوں میں توحید کی قندیلیں فروزاں کیں، اور اظہارِ حق و بے باکی کے جذبوں کی پرورش کی، جس نے عدل و انصاف کا بول بالا کیا۔ جس نے دنیا میں رہنے کے گُر بتائے۔ عمل و سیرت کے گوشوں کو زینت بخشی۔ اور مجموعی حیثیت سے فرد و معاشرہ کی توجہ کو نفس کی ادنیٰ خواہشات سے ہٹا کر اللہ کی طرف موڑ دیا۔ اور آج اس مادیت کے دور میں بھی، اگر خوب کو سراہا جاتا ہے، خیر کی تعریف کی جاتی ہے اور قلب و ضمیر کی گہرائیوں میں نیکی اور خیر سگالی کی تڑپ پائی جاتی ہے اور لوگ مادی ترقی کے پہلو بہ پہلو اخلاقی اقدار کی اشاعت و فروغ کے حامی ہیں تو یہ ان پاکباز اور مقدس ہستیوں کا صدقہ ہے جنھوں نے اپنی پوری زندگی میں سچ پر آنچ نہ آنے دی اور ظلم و تعدی کی آندھیوں میں بھی حق و صداقت کے چراغوں کو روشن رکھا۔

انبیا کے اس دین کو ترک کر کے اس دور کے انسان نے کیا کھویا، اور کیا پایا۔ یہ داستان بہت دلچسپ ہے۔ دین نے انسان کے اندر چھپے ہوئے اس بلند تر انسان کو اُبھارنے اور اُجاگر کرنے کی کوشش کی تھی، جو تہذیب و ثقافت کے بارہ میں روحانی اقدار کا خیال رکھتا ہو، جو صرف گوشت پوست کی پرورش و اہتمام ہی کا حامی نہیں بلکہ روح کی توانائی اور باطن کی تابندگی کا بھی اتنا ہی خواہاں ہے۔ دین نے انسان میں اس احساس کو بیدار کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی کہ یہ صرف "حیوان نہیں" ہے اور ارسطو کی اصطلاح میں حیوان عاقل بھی نہیں۔ بلکہ اس میں ایک لطیف، مقدس اور نورانی عنصر ایسا بھی شامل ہے جس کی وجہ سے یہ "احسن تقویم" کے لقب سے سرفراز ہوا جس کی وجہ سے اس کا رابطہ، اللہ تعالیٰ سے استوار ہوتا ہے، اور اس کو عبدیت کا وہ مقام عطا ہوتا ہے کہ

جہاں معبودِ حقیقی کی توجہات خاص اس کو گھیر لیتی ہیں لیکن بُرا ہو مادیت کا اس نے اس کو "حیوانیت" کی انہی پستیوں میں لا پھینکا ہے جہاں سے اس نے اپنے روحانی سفر کا آغاز کیا تھا۔

موجودہ غیر دینی تہذیب کی سب سے بڑی اور اصولی غلطی اور محرومی ہی تو ہے کہ انسان نے بقائمی ہوش و حواس اس بات کو مان لیا ہے کہ وہ حیوان اور صرف حیوان ہے۔

اس مرحلہ پہ ہم ڈارون کے نظریۂ ارتقا سے دو وجہ سے تعرض نہیں کرتے۔ ایک تو یہ کہ ہمارے ہاں کے مفکرین یعنی ابن خلدون، ابن مسکویہ اور رومی نے بھی تجربہ اور سائنس کے بل پر نہ سہی، ادراک و بصیرت کی سطح پر اس حقیقت کو بہر حال پا لیا تھا کہ زندگی ایک طویل سفر کے بعد انسان تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود یہ لوگ بھی انسانیت کی طرف سے مایوس نہیں ہوتے اور کبھی بھی انسان میں جو روحانی و اخلاقی مضمرات ارتقا پائے جاتے ہیں ان سے منکر نہیں ہو پاتے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ نظریۂ ارتقا کے یہ معنیٰ ہی کب ہیں کہ چونکہ اس ارتقا کی ایک منزل حیوانیت تھی لہٰذا یہ اب بھی صرف حیوان ہی ہے۔ اور اس میں حیوانیت کے ساتھ ساتھ فہم و ادراک کے نئے نئے پہلوؤں نے ترقی نہیں کی۔

سائنس کی زبان میں ہم پوچھ سکتے ہیں کیا یہ ارتقا نوعی قسم کا نہیں اور اگر نوعی قسم کا ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ حیوانیت اس کے سفر میں ایک منزل تھی، اس میں مخصوص حالات و ظروف میں رہنے سے اس حقیقت کا بھی اضافہ ہوا ہے جس کو قرآن حکیم نے جنین کے کوائف بیان کرتے ہوئے "خلقاً آخر" لفظ سے تعبیر کیا۔

اس آیت میں قرآن حکیم یہ کہنا چاہتا ہے کہ انسان میں قطرۂ آب سے لے کر علقہ اور مضغہ تک جو تبدیلیاں ہوتی ہیں ان سب کا تعلق تو بلاشبہ مقدار (Quantity) کی تبدیلی سے تھا لیکن اس کے بعد اس میں جو تبدیلی آئی، وہ پہلی تبدیلیوں سے بالکل مختلف نوعیت (Quality) کی تبدیلی ہے۔ لہٰذا اب یہ اور نوع ہے، اور اور حقیقت ہے یعنی اب انسان صرف وہ انسان نہیں رہا جو محض گوشت پوست سے ترکیب پاتا ہے، بلکہ اس کی فطرت میں ایسے "نئے مضمرات" کو داخل کر دیا، یا سمو دیا گیا ہے۔ جو اس کو حیوانیت کی اس سطح سے اٹھا کر

روحانیت و اخلاق کے فرازِ اعلیٰ تک اچھال دینے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں - اور یہی اس کی زندگی کا اصل مقصد ہے - اب آدم جو اس نوع کا پہلا قافلہ سالار ہے، صرف آدم ہی نہیں، اللہ کا پیغمبر بھی ہے - اور اسے دنیا میں اب ایسی تہذیب و ثقافت کو رواج دینا ہے، جس سے انسان یہ ثابت کر سکے کہ یہ دنیا میں جس نیابت کا علمبردار ہے، وہ ان حیوانی و سفلی آرزوؤں کی نیابت نہیں بلکہ اللہ کی نیابت ہے - یعنی اب اسے علم پھیلانا ہے، حکمت و دانائی سے آراستہ ہونا ہے - تخلیق و آفرینش کے فرائض انجام دینا ہے - تسخیر کائنات کی مہم سر کرنا ہے - اس لیے نہیں کہ موجودہ تہذیب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موت و ہلاکت کے گڑھوں میں ڈھکیل دیا جائے، بلکہ اس لیے کہ ایک ایسی نئی تہذیب کو بروئے کار لایا جائے، جو انسان کو زیادہ سے زیادہ خوشیوں اور مسرتوں سے مالا مال کر دے - اب اسے اللہ سے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو استوار کرنا ہے اور دین سے منحرف اور بھاگی ہوئی قوموں کو پھر سے اس کی چوکھٹ پر جھکانا ہے "مقامِ انسانیت" کے بارہ میں اسی سوال کے جواب پر کسی بھی قوم و ملک کی تہذیب و تمدن کی کامیابی یا ناکامیوں کا انحصار ہے کہ ہمارا تہذیبی سفر کس نقطہ یا مفروضہ سے شروع ہو - کیا ہم صرف حیوان ہیں، اور عاقل ہونے کی حیثیت سے اس سے زیادہ کے مکلف نہیں کہ ان ضرورتوں اور تقاضوں کی تکمیل و ارتقا کے سلسلہ میں کوشاں رہیں، جو ہماری حیوانی فطرت کی جانب سے ہم پر عائد ہوتے ہیں - یا ہمارا شرفِ انسانیت اس سے زیادہ کا مقتضی ہے اور ہمارے وجود کا ایک سرا اگر گوشت پوست سے تعلق رکھتا ہے تو دوسرا ان ملکوتی اور قدوسی صفات سے ملا ہوا ہے جن کی وجہ سے یہ انسان مسجودِ ملائک اور اشرف المخلوقات ہونے کا بجا طور پر دعویدار ہے - مغرب کی گمراہی یہ ہے کہ اس نے اپنے تہذیبی سفر کا آغاز حیوانیت کے نقطۂ نظر سے کیا - اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج کا انسان اپنی حیرت انگیز فکری صلاحیتوں کے باوجود حیوانیت کی کھال سے باہر نہیں نکل سکا - اور روز بروز جنسی بے راہ روی، اخلاقی انحطاط، ظلم اور استحصال کا خوگر ہوتا چلا گیا - تہذیب و ثقافت کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس سوال کا دو ٹوک جواب دینا مشکل ہے، کیونکہ اس سے بھی پہلے دریافت طلب بات یہ ہے کہ کون تہذیب و ثقافت زیرِ بحث ہے؟ اگر انسان ایک سادہ، ابتدائی معاشرہ کا رکن ہے، تو اس کا اشکال یہ ہے کہ اس معاشرہ کو تہذیب و تمدن کی جملہ برکات اور سہولتوں سے بہرہ مند کیا جائے - اور اگر اس کے برعکس وہ اس معاشرہ

میں رہ رہا ہے، جہاں پوری زندگی صنعتی ارتقا کے سانچوں میں ڈھل چکی ہے، اور کل پرزوں کی ہمہ گیری نے انسان کو بھی کل پرزہ کے روپ میں بدل دیا ہے، اس کی انفرادیت کو ختم کر دیا ہے، اس سے اس کے فرصت کے عزیز لمحوں کو چھین لیا ہے، اس کے لطیف جذبات و احساسات کو کچل دیا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عظیم اور فعال انسان مشین کا محض ضمیمہ بن کر رہ گیا ہے تو ان حالات میں تہذیب و ثقافت کا مطمح نظر یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایسے خوش آیند حالات پیدا کرے، جن سے انسان پھر اپنی گمشدہ عظمت کو پالے۔ یعنی تہذیب کے دھاروں پر ضبط اور قابو حاصل کر سکے اس کو زیادہ سے زیادہ معقول (Rational) بنیادوں پر استوار کر سکے اور بجائے اس کے کہ اس کی حیثیت محض مقہور و مجبور انسان کی ہو۔ اس میں جباری و قہاری کی وہ صفات دوبارہ پلٹ آئیں۔ جن سے کہ اس کا پیرہن ذات تیار ہوتا ہے۔

اس صورت میں اس صنعتی ارتقا کی ہمہ گیریوں کو مختصر کرنا ہوگا۔ اس کے جبر کے دائرہ کو سمیٹنا ہوگا۔ اور انسانی زندگی کے قلبی و فکری لطائف کو اس کی آہنی گرفت سے زیادہ سے زیادہ مقدار میں رہائی دلانا ہوگی۔

آپ تاریخ پر غور کیجیے۔ شروع سے لے کر اب تک آپ یہ دیکھیں گے کہ یہی دو محور ہیں جن کے گرد انسان کی فکر و عملی کوششیں گھومتی رہتی ہیں اور ہمیشہ انہی کے گرد گھومتی رہیں گی۔ یعنی اگر قانون اور معاشرہ سادہ ہے تو اس کو وسعت دی جائے، اس کو زیادہ مفصل، زیادہ پیچیدہ اور ہمہ گیر بنایا جائے۔ اور اگر اس پیچیدہ تر زندگی کے قفس میں انسانیت کا دم گھٹنے لگے اور طائر روح پھڑپھڑانے لگے تو اس کے کچھ حلقوں اور تیلیوں کو توڑ دیا جاتے۔ اجمال و تفصیل، سادگی و رنگا رنگی کے انہی دو نقطوں کے مابین فکر و عمل کی تگ و تاز کو ترتیب دینا تہذیب و ثقافت کی اصل غرض و غایت ہے۔

لیکن یہ سوال اسی موڑ پر ختم نہیں ہو جاتا حل طلب یہ بحث رہ جائے گی کہ جب تک تہذیب و تمدن کے شعوری ارتقا کے لیے کوئی نصب العین متعین نہ کیا جائے اور نہ بنایا جائے کہ کیونکر ہم اس کو زیادہ مفید بہتر اور حسین بنا سکتے ہیں، اجمال سے تفصیل کی طرف بڑھنے اور تفصیل سے اجمال و اختصار کی راہوں کو اختیار کرنے میں سخت دشواری پیش آئے گی۔

ہماری رائے میں اس سوال کا جواب اس وقت آسان ہو جائے گا جب ہم اس آخری اہم سوال